افکارِ اقبال اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

محمد سرفراز خالد☆

علامہ اقبالؒ وہ آفاقی شاعر ہیں جن کے کلام میں مضامین کی ایسی قوس قزح پائی جاتی ہے کہ کوئی بھی شخص ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گفتگو خواہ مظاہر فطرت کی ہو، سیاسیات وحکومت کی ہو، تعلیم وتربیت کی ہو، خودی وخودداری کی ہو یا دین و دنیا کی ہو، الغرض مقرر یا مضمون نگار کسی موضوع پر بھی اظہارِ خیال کرے وہ سمجھتا ہے کہ میری بات اس وقت تک اثر پذیری حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ اُسے کلام وافکارِ اقبال سے مزین و مرصع نہ کیا جائے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا شمار اگرچہ برصغیر پاک و ہند کے ان جلیل القدر علماء میں ہوتا ہے جنہیں اپنے علم وفضل کی وجہ سے چہار دانگ عالم میں شہرت حاصل ہے مگر آپ بھی کلامِ اقبال اور افکارِ اقبال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ جس کا برملا اعتراف مولانا نے اِن الفاظ میں کیا ہے:

> ''سب سے بڑی چیز جو مجھے ان کے فن کی طرف لے گئی وہ بلند حوصلگی، محبت اور ایمان ہے۔ جس کا حسین امتزاج ان کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے۔ اور جن کا ان کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا۔ میں اپنی طبیعت

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج آف کامرس علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

اور فطرت میں انہی تینوں کا دخل پاتا ہوں۔ میں ہر اس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں جو بلند حوصلگی اور احیاء اسلام کی دعوت دیتا اور تسخیر کائنات اور تعمیر النفس و آفاق کے لئے ابھارتا ہے۔ جو مہر و وفا کے جذبات کو غذا دیتا ہے اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے، جو محمد ﷺ کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت و ابدیت پر ایمان لاتا ہے۔''

''میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اس لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں، دعوت و پیغام رکھتے ہیں ، اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں..... وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبالِ گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکرمند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت واسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔''(۱)

کلام اقبال کے مطالعہ سے قاری دنگ رہ جاتا ہے کہ حکیم الامت اور دانائے راز نے ایسے ایسے مضامین بیان کئے ہیں جو ان کو عام شاعروں سے بہت بلند مقام پر فائز کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا زورِ بیاں عطا کیا ہے جس کی بدولت وہ دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور رب ذوالجلال کی طرف سے یہ خوشخبری لوگوں تک پہنچاتے ہیں کہ محمد ﷺ کے ساتھ خلوص و وفا کرنے والوں کو دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر لوح وقلم عطافرما دیئے جائیں گے تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنے لئے ویسی تقدیر لکھ لیں۔ اقبال کے اسی پیغام سے متاثر ہو کر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے جذبات کی یوں ترجمانی کی ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؒ وہ شاعر ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے مطابق بعض حکم و حقائق کہلوائے ہیں، جو کسی دوسرے معاصر

شاعرومفکر کی زبان سے ادا نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ پیغام محمدیؐ کے بقائے دوام، امت مسلمہ کے استحکام، اس کی قائدانہ صلاحیت، عصری نظریات و فلسفہ کی بے مائیگی پر ان کے پختہ عقیدہ سے ان کے فکر میں وضاحت و پختگی آئی ہے، اور ان کی خودی کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس معاملے میں وہ خاص کر دینی علوم کے ان فضلاء سے بھی آگے ہیں جو مغربیت کی حقیقت سے واقف نہیں اور نہ انہیں اس کی حقیقی اغراض و مقاصد اور تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔

آخر میں پھر کہتا ہوں کہ انہیں میں نے اولو العزمی، محبت اور ایمان کا نوجوان شاعر پایا اور اپنے بارے میں میری گواہی یہ ہے کہ جب جب بھی ان کا کلام پڑھا تو دل جوش سے امنڈنے لگا، اور لطیف جذبات نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں، احساسات و کیفیات کی لہریں بیدار ہونے لگیں، اور رگوں میں شجاعت اسلامی کی رَو دوڑنے لگی۔ میری نظر میں یہی ان کے شعر کی اصل قدر و قیمت ہے۔(۲)

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے کلام کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت سے کیا جائے تا کہ حکیم الامت کے افکار کی تفہیمِ حقیقی حاصل ہو، کیونکہ کلام اقبال کا سنجیدگی اور احترام سے مطالعہ کئے بغیر ملت اور ملت کے لئے بخشے ہوئے فضائل کا ادراک و احساس آسان نہیں ہے۔ یہ فیضان ہے عشق مصطفےٰ ﷺ کا جس نے ان کے کلام کو گراں مایہ اور لازوال بنا دیا ہے۔ سید صاحب کا کلامِ اقبال کی طرف راغب ہونا اور اس سے اصلاح امت کا کام لینا اس کا واضح اور بین ثبوت ہے کہ آپ نے کلامِ اقبال کا مطالعہ عمیق نظروں اور بصیرت سے کیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے نقوش اقبال کے مقدمہ میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کی

بصیرت اور عمیق نظری کے بارے میں یوں بیان فرمایا ہے:

''علمائے کرام کا اقبالؒ کو سمجھنے کی کوشش کرنا خود ان کے لئے نہایت ضروری اور نیک فالی ہے، اس لئے کہ اب مذہب اور زندگی کی تفہیم اسی طرح اور اسی سیاق و سباق میں کی جائے، جو ہم کو اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ سید صاحب کا ذہن، جدید ذہن کے تقاضوں سے آشنا ہے اور اس کا لحاظ رکھتا اور احترام کرتا ہے۔''(۳)

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے لئے سعادت مندی یہ بھی ہے کہ مولانا کو علامہ اقبالؒ سے ملاقاتیں کرنے اور ان کے پیغام و افکار سے براہ راست شناسائی کا موقع میسر آیا۔ فرماتے ہیں:

''اقبال سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں ہوئی جب میں اپنی عمر کے سولہویں سال میں تھا، یہ وہ موقع تھا جب میں نے شہر علم و ثقافت..... لاہور کی سیر کی۔ مئی کے آخری گرم دن تھے، جب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مجھے اقبالؒ کی خدمت میں لے گئے اور مجھے ان کے شعر کے شائق کی حیثیت سے پیش کیا۔.....اسلام کے اس عظیم شاعر کی وفات سے چند ماہ پہلے ایک تفصیلی اور تاریخی ملاقات کا موقع ملا۔ (۱۶۔ رمضان ۱۳۶۵ھ ۔ ۲۲ نومبر ۱۹۳۷ء) کی تاریخ تھی جب میں اپنے پھوپھا سید طلحہ حسنی کے ساتھ ان کے دولت کدے پر گیا۔ برادرِ عزیز مولوی سید ابراہیم حسنی بھی میرے ساتھ تھے۔ یہ اقبالؒ کی طویل علالت کا زمانہ تھا لیکن وہ بڑے نشاط و انبساط کے ساتھ ملے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم لوگوں کی آمد سے انہیں یہ وقتی مسرت حاصل ہوئی ہو، غرض اس دن ان کی طبیعت کے بند کھل گئے تھے، ہماری نشست بڑے خوشگوار ماحول میں

جاری رہی، ان کا بوڑھا خادم (علی بخش) بیچ بیچ میں آ کر انہیں زیادہ بیٹھنے اور بات کرنے سے روکنا چاہتا، لیکن وہ اسے ٹال جاتے۔ اس نشست میں ہر طرح کے موضوعات زیر بحث آتے رہے۔(۴)

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے علامہ اقبالؒ پر کئی مضامین عربی زبان میں لکھے جو عرب ممالک کے نہ صرف اخبار و جرائد میں شائع ہوتے رہے بلکہ حجاز ریڈیو سے نشر بھی ہوئے۔ انہی ایام میں ایک عرب سکالر ڈاکٹر عبد الوہاب عزام جو اپنی عربی اور فارسی زبان دانی میں مشہور تھے اور علامہ اقبال سے فکری تعلق رکھتے تھے، ان کے بھی کئی ایک مضامین جو اقبال کے تراجم پر مشتمل تھے شائع ہونے لگے۔ چنانچہ مولانا نے اس طرف اپنی توجہ کم کر دی۔ مگر رسالہ " المسلمون" میں مولانا کے نام چھپنے والے ایک کھلے خط نے ان میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا جس کے بارے میں مولانا بیان فرماتے ہیں:

''اپنی متنوع مصروفیات کے سبب ترجمہ کا کام شروع کرنے پر کوئی آمادگی نہیں تھی لیکن ایک واقعہ نے عزم خفتہ کو بیدار کر دیا اور نشاط تازہ ہو گیا۔ میں نے دمشق کے موقر رسالہ " المسلمون" میں عربی کے مشہور ادیب علی طنطاوی کا کھلا خط پڑھا، جس میں انہوں نے مجھے شعرِ اقبال کے ترجمہ کی دعوت دی کہ اقبال کا عرب میں تعارف ہو۔ اور ان کی شاعری کے پیام کو صحیح شکل میں دیکھا جا سکے۔

انہوں نے لکھا تھا کہ کیا آپ شعر اقبال کے منتخب حصے کا ترجمہ کر کے ہمیں اقبالؒ اور ان کے فکر وعقیدہ کی عظمت کو سمجھنے اور اس کا راز معلوم کرنے کا موقع عنایت فرمائیں گے اس لئے کہ ان کے عربی ترجمے ہمارے درمیان سے اجنبیت کی دیوار پوری طرح نہیں ڈھا سکے ہیں، کیا آپ اس جلیل القدر خدمت کو اپنی خدمت میں شامل کریں گے۔ اور اس

نظروں سے اوجھل چمن زار کی سیر کا موقع دیں گے ، یا ہدیۂ شمیم و نکہت بھیج کر اس گلستان سے محروم لوگوں کو نوازیں گے؟

اس پیشکش کا جواب گرم جوشی سے دیا گیا۔ اور اس نے بجھی اور تھکی ہوئی طبیعت میں ازسرنو تازگی اور آمادگی پیدا کر دی، جس کے نتیجے میں مسجد قرطبہ کا ایک ہی نشست میں ترجمہ ہو گیا۔ اور میں نے اپنے اندر ترجمہ کا ایک ایسا اندرونی تقاضہ اور جذبہ محسوس کیا جس کو میں دبا نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد مسلسل کئی مقالات لکھے گئے۔'' (۵)

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے ان مقالات کو عرب ممالک کے موقر جرائد میں شائع ہونے کا موقع میسر آیا جس سے عرب دنیا میں اقبال کا پیغام روشناس کرانے کا گراں قدر کام سرانجام دیا گیا۔ بعد میں ان تمام مضامین کو ایک کتابی شکل دی گئی جو ''روائع اقبال'' کے نام سے شائع ہوئی اور عرب دنیا میں اقبال اور فکر اقبال کی اشاعت و ترویج کا باعث بنی۔ خود مصنف کی اس کے بارے میں رائے ہے:

''یہ کتاب ان مضامین اور خطبات کا مجموعہ ہے جو عرب نوجوانوں اور عرب ممالک کے فضلاء اور اقبال کے نادیدہ قدر دانوں اور ان کے کلام کے شائقین کے لئے تیار کئے گئے تھے، اور ان کا مقصود ان لوگوں کو کلام و پیامِ اقبال سے آشنا کرنا تھا، جو فارسی اور اردو سے نابلد ہیں اور جن کے لئے عربی زبان کے سوا افہام و تفہیم کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔'' (۶)

کتاب کی قبولیت عامہ کو دیکھ کر بعض کرم فرماؤں نے اس کے اردو ترجمہ کی بھی فرمائش کی۔ مصنف نے کچھ پس و پیش کے بعد اس پر آمادگی کا اظہار کیا، لہٰذا مولانا شمس تبریز خان صاحب نے جانفشانی اور دلجمعی کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ کیا جو ''نقوش اقبال'' کے نام سے شائع ہوا۔ مترجم نے اس قدر سلیس ترجمہ کیا ہے کہ نہ صرف مصنف کے خیالات کی

درست ترجمانی کی ہے بلکہ اس کی روانی سے اس پر ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔ نامور محقق اور نقاد جناب ماہر القادری ترجمہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے: جیسے شبلی کا قلم، غزالی کی فکر، اور ابن تیمیہ کا جوش و اخلاص اس تصنیف میں کارفرما ہے، ترجمہ انتہائی سلیس اور شگفتہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مولوی شمس تبریز خان نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔''(۷)

خود مولانا ابو الحسن علی ندوی نے اس ترجمہ کی مقبولیت اور پذیرائی پر اظہار تشکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''دل حمد و شکر سے لبریز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''نقوشِ اقبال'' کو مقبولیت عطا فرمائی اور ملت کو اقبال کے پیغام میں دلچسپی لینے کی توفیق ارزانی کی۔ اور اقبالؒ کی یہ توقع ایک بار پھر دوسرے انداز میں پوری ہوئی کہ

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی! (۸)

ایک دوسرے مقام پر مولانا نے نقوش اقبال کے برصغیر پاک و ہند میں قبولیت عام حاصل کرنے پر مسرت و اطمینان کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''مسرت اس بات پر کہ مصنف کے نقوش قلم نے اقبال کے نقوش جاوداں کے ساتھ ہم آغوش ہو کر تابانی اور درخشانی پائی، اور ان کا ستارۂ اقبال بھی بلند ہوا۔

جمال ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم (۹)

''نقوش اقبال'' میں مولانا ابو الحسن علی ندوی نے علامہ اقبالؒ کے افکار و نظریات

کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتاب علامہ اقبال کے افکار و نظریات کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ اگر اُن عنوانات کو زیر بحث لایا جائے تو اس کے لئے بھی ایک علیحدہ دفتر کی ضرورت پیش آ سکتی ہے مگر اس کام کی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس سے بدرجہ اولیٰ یہ ہے کہ مولانا کی دیگر تصانیف میں سے آپ کی ان تحریروں کا انتخاب کیا جائے جن میں آپ نے علامہ اقبالؒ کے اشعار سے اپنی گفتگو کو مرصع کیا ہے۔ لہٰذا ہمارا یہ مقالہ انہی تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ہے۔

عشق مصطفےٰ ﷺ

علامہ اقبالؒ کے افکار میں سب سے اہم عشق مصطفےٰ ﷺ ہے اور اپنی بارہا نظموں اور خصوصاً جواب شکوہ میں لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کروائی ہے کہ:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خُم بھی نہ ہو　　بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے(۱۰)

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۱۹ء بمطابق ۷ جنوری ۱۹۹۹ء کو دبئی کے مشہور زمانہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں منعقدہ ایک تقریب میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے عرب قوم کی توجہ اسی جانب مبذول کراتے ہوئے فرمایا:

> ''عربوں کو جو دولت و نعمت، سعادت و توفیق اور منصب ہدایت و راہنمائی ملا، وہ سب نبی عربی اُمی مکی مدنی خاتم النبین و سید المرسلین محمد ﷺ کے طفیل میں تھا اور آپؐ کے ذریعہ ہی ملا۔ اگر اس حقیقت سے قطع نظر کر لیا جائے اور اتباع و اقتداء کا رشتہ نہ رہے تو عرب قوم فنِ عروض کی اصطلاح ''بحر'' کی طرح ہو جائے گی کہ اس کو بحر کہتے ہیں، لیکن اس میں

پانی کا ایک قطرہ نہیں ہوتا۔ اور وہی اس سلسلہ میں شکر و اعتراف اور تمسک و اتباع کے مستحق ہیں۔''

اس مضمون کے پڑھنے کے بعد راقم نے جب دیکھا کہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی بڑی تعداد موجود ہے تو اس مضمون کا حاصل علامہ اقبال کے شعر کی شکل میں سنایا اور اس کو بار بار پڑھا جس میں پوری وضاحت اور قوت ایمانی کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے وہ کہتے ہیں:

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربیؐ سے ہے عالم عربی (۱۱)

یہی وہ دولت و ثروت ہے کہ پوری دنیا کی نعمتیں جس کے آگے ہیچ نظر آتی ہیں ضرورت ایسی بصیرت و بصارت کی ہے جو اس کو دیکھ اور پرکھ سکے۔

''آپ اپنی اصل قوت اور حقیقی دولت لے جائیں اور پورے اعتماد و یقین کے ساتھ زندگی کے میدان میں آئیں۔ اس میدان میں آپ کا کوئی حریف نہیں۔ آپ کے پاس انسانیت کے لئے جو دعوت اور پیغام ہے، آپ کے پاس علم و حقیقت کا جو سرچشمہ ہے، آپ کو جس ذات گرامی سے نسبت غلامی حاصل ہے۔ اس کے بعد آپ میں سے ہر شخص کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے، کہ

عجب کیا گر مہ و پروین مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سر خود را
وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا (۱۲)

دور جدید جسے سائنس اور ایجادات کا دور کہا جاتا ہے جس سے متاثر ہو کر آج کا

مسلم نوجوان اسلامی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے سے اجتناب کرتا ہے کہ شاید یہ عصرِ حاضر کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں عرفان ہوجائے تو یہی دور حاضر کی فلاح کا راستہ ہے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے آج کے طالب علم کو عزم و حوصلہ عطا کیا ہے:

''آپ دنیا سے واقف نہیں، آپ کو معلوم نہیں کہ زمانہ کس قدر بے بضاعت و تہی دامن اور کس قدر تشنہ لب ہے۔ آپ اس زمانہ کو مرعوب اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں اس لئے کہ آپ اس سے ناآشنا ہیں۔ آپ اس کو قریب کی نظروں سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ کس درجہ دیوالیہ ہے اور اس کو اپنے دیوالیہ پن کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ اور اس کے سب سکے کھوٹے نکلے۔ اس کے سب تیر دغا دے گئے۔ اس کے سب چشمے سراب ثابت ہوئے۔ اس کے سب فلسفے اور نظام اس کے سب ازم ناکام رہے۔ اس کے سب خواب بے تعبیر رہے۔ آپ کے پاس نبوت محمدی ﷺ کے عطا کئے ہوئے جو حقائق ہیں، ان کو اپنی کم نظری سے پیش کرتے ہوئے آپ شرماتے ہیں کہ زمانہ سائنس، سیاسیات اور اقتصادیات کی ترقی کا ہے۔ لیکن دنیا کا حال یہ ہے کہ آج وہ انہیں کے لئے بے تاب اور چشم براہ ہے۔ آج قومیں ان لوگوں کے انتظار میں ہیں جو ان کو زندگی کا نیا راستہ بتلائیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام حیات سنائیں۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد (۱۳)

مولانا کو اکثر دیارِ نبی ﷺ میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی آپ اپنا بہت سا

وقت مسجد نبویؐ میں گزارتے اور رحمت للعالمین ﷺ سے نظر کرم کی التجا کرتے۔ اپنے اس مبارک سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے اپنی سعادت مندی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''عصر کی نماز کے علاوہ، جو اپنے ضعف و ماندگی اور مسجد شریف میں بہت سویرے ہونے کی بنا پر مجھے قیام گاہ پر پڑھنی ہوتی تھی، چاروں وقت حاضری کی توفیق ہوتی..... مغرب اور عشاء کے درمیان کا وقت حسب معمول مسجد میں ہی گذارنے کی سعادت حاصل ہوتی، جو مختصر لیکن بڑا قیمتی اور مبارک وقت ہوتا ہے۔

اس مرتبہ اکثر حاضری کے موقعہ پر اقبالؒ مرحوم کے دو شعر بے اختیار زبان پر آتے اور حسب حال ہونے کی وجہ سے خاص لطف دیتے۔

آہوئے را زو زبوں و ناتواں
کس بہ فتراکم بہ نسبت اندر جہاں
اے پناہ ما حریم کوئے تو
من بہ امیدے رمیدم سوئے تو'' (۱۴)

مولانا کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ علامہ اقبالؒ کے ساتھ اکثر ملاقاتوں میں عشق رسولؐ پر گفتگو کا موقع میسر آیا۔ ان کے عشق رسول ﷺ کی گواہی مولانا نے ان الفاظ میں دی ہے:

''ہمارے عظیم شاعر محمد اقبال کا یہ حال تھا (اس کا میں عینی گواہ ہوں اور مسجد نبوی کے جوار میں اس کی گواہی دے سکتا ہوں) کہ ذات نبوی ﷺ روحی فداہ کا ذکر تو بڑی چیز ہے، آپ ﷺ کے شہر مدینہ کا نام آنے پر ان کی آنکھیں اشکبار اور ان کا دل بے قرار ہو جاتا تھا۔

یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ میں فارسی میں ان کے دو شعر پڑھوں کیونکہ یہاں

فارسی جاننے والے بھی موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سر شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ" (۱۵)

خود داری و خود شناسی

علامہ اقبالؒ کے افکار و پیغام میں دوسرا اہم پیغام خود داری و خود شناسی ہے۔ وہ انسان کو نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جان پر سوز رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور کہیں غریبی میں نام پیدا کرنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی علامہ اقبال کے انہی افکار ونظریات سے اصلاح امت کا بیش قیمت فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

"آپ کے پاس جو دولت ہے اس سے دنیا کا دامن خالی ہے۔ آپ کے سینہ میں علومِ نبوت ہیں۔ اور وہ حقائق ہیں جو دنیا سے گم ہو چکے ہیں۔ اور جن کے گم ہونے سے آج عالم میں اندھیرا ہے، اضطراب وانتشار ہے، شر و فساد ہے، آپ اپنے ان سادہ کپڑوں، ان حقیر جسموں اور اس خالی جیب و دامن پر نظر نہ کریں۔ آپ دیکھیں کہ آپ کا سینہ کن دولتوں سے معمور، اور آپ کے اندر کیسا بدر کامل مستور ہے۔

بر خود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند" (۱۶)

انسان کو اگر عرفان ذات حاصل ہوجائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے، اکثر اوقات انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ لوگ اسے حقیر اور بے مایہ سمجھتے ہیں اور دنیا میں وہ بے وقعت اور کمتر ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ بذات خود اپنے مقام و مرتبہ کو پہچانے اگر اس نے

خود کو اپنی نگاہ میں ذلیل کر لیا تو کوئی دوسرا اسے باعزت نہیں بنا سکتا۔

''آدمی کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے دل میں کیا مقام دیا ہے اور اس کا معاملہ خود اپنی ذات کے ساتھ کیا ہے۔ اگر کسی نے اپنے کو ذلیل وحقیر، مجبور و بے بس، تہی دست و بے بضاعت اور دنیا کے بازار میں بے قیمت و بے ضرورت سمجھ لیا تو اس کو دنیا سے کسی انصاف اور کسی اعزاز کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔ حاتم طائی نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

ونفسک أکرمها فانک ان تَهُنْ

علیک فلن تلقٰی من الناس مکرما

''اپنی ذات کی خود عزت کرو، اس لئے کہ اگر تم اپنی نگاہ میں ذلیل اور بے وزن ہو جاؤ گے تو پھر دنیا میں تمہیں کوئی بھی عزت کرنے والا نہیں ملے گا۔''

دوستو! مجھے یقین ہے کہ ہم حقیر نہیں ہیں، صرف احساسِ حقارت کے مریض ہیں، اور یہ احساس حقارت ہماری خود ناشناسی اور خود فراموشی پر مبنی ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مقام سے باخبر ہو جائیں اور اپنی دولت اور سرمایہ کا صحیح جائزہ لیں، دنیا کی تبدیلی، نگاہوں کی تبدیلی، سب ہماری نگاہ کی تبدیلی کے تابع ہے۔ جس دن ہماری نگاہ بدلی، دنیا بدل جائے گی۔ اور حقارت کا یہ مہیب سایہ جو ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہے اور ہم کو ڈرا رہا ہے کافور ہو جائے گا۔ کہنے والے نے کچھ غلط نہیں کہا

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو

تیری سپہ انس وجن، تو ہے امیر جنود (۱۷)

انسان آج کل اپنے مقصد حیات کو بھلا کر مال و زر کی ہوس میں گرفتار ہے، مسجدوں میں اللہ کا ذکر ہو رہا اور نہ گھروں میں۔ انسان اس طرف غور نہیں کرتا کہ اگر دولت کمانا اور پیٹ بھرنا ہی اس کا کام ہے تو پھر اسے یہ دل و دماغ کیوں عطا کئے گئے ہیں۔ اور یہ بلند پرواز روح کیوں بخشی گئی ہے۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی جب عرب ممالک میں یہ سارا منظر دیکھتے ہیں تو ان کی روح تڑپ اٹھتی ہے۔

''عرب ممالک اس احساس کمتری اور مرض خود فراموشی کا سب سے زیادہ شکار ہیں۔ دنیا نے اگرچہ انہیں سے نئی زندگی اور نیا ایمان پایا ہے، لیکن آج انہیں کی فضا سب سے زیادہ خاموش اور انہیں کا سمندر سب سے زیادہ پرسکون ہے۔ اقبال نے چند برس پہلے ان ملکوں کو دیکھ کر بے جا نہیں کہا تھا کہ

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذان میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب'' (۱۸)

''عالم انسانی عالم اسلامی کی طرف، اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے اور عالم اسلامی، عالم عربی کی طرف اپنے لیڈر اور رہبر کی حیثیت سے نظریں اٹھائے ہوئے ہے۔ کیا عالم اسلامی، عالم انسانی کی توقع پوری کر سکتا ہے۔ اور کیا عالم عربی، عالم اسلامی کے سوالوں کے جواب دے سکتا ہے؟ عرصہ سے مظلوم انسانیت اور برباد شدہ دنیا اقبالؔ کے پُردرد الفاظ میں مسلمانوں سے فریاد کر رہی ہے۔ اس کو اب بھی یقین ہے کہ جن مخلص ہاتھوں نے کعبہ کی تعمیر کی تھی وہی دنیا کی تعمیر نو کا

فرض انجام دے سکتے ہیں۔ ؎

ناموس ازل را تو امینی، تو امینی　　دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی　　صہبائے یقین در کش و از دیر گماں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز، خوابِ گراں خوابِ گراں خیز'' (۱۹)

عزم و استقلال

علامہ اقبالؒ کے پیغام کی تیسری اہم خوبی عزم و استقلال ہے اور وہ قوم کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات قرار دیتے ہیں۔ اور کبھی شاہیں کی مثال دے کر اسے جہد مسلسل کا درس دیتے ہیں۔ تندی باد مخالف سے گھبرانے کی بجائے اسے اونچی پرواز میں معاون و مددگار بنانے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی علامہ اقبال کے انہی افکار سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور اپنے پیغام میں جابجا ان کے شعروں سے زور بیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''اصل انقلاب انگیز طاقت اور ناممکن کو ممکن بنانے والی چیز اُس ہستی کا وجود ہے جو عزم وایمان کو خارق عادت سے سرشار، صورت حال کو یکسر تبدیل کر دینے کے لئے ہمہ تن تیار اور اس کی راہ میں ہر طرح کی قربانی و جان نثاری، خطر پسندی و مہم جوئی کے لئے مضطر و بے قرار ہو، تاریخ کی شہادت ہے کہ اس موقع پر یہ ٹھوس اعداد و شمار اور مشکلات اور مخالفتوں کے پہاڑ برف اور موم کی طرف پگھل کر پانی ہوجاتے ہیں۔ اور فتح کا آفتاب رات کے اندھیرے اور سردی کے کہر کو چیرتا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ یہی سلطان صلاح الدین ایوبی کی سرگزشت اور جنگ صلیبی کی تاریخ کا خلاصہ ہے ۔ اقبال نے اسی

حقیقت کو اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف
صحبت پیر روم سے مجھ پر ہوا یہ نکتہ فاش
لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف'' (۲۰)

یقیناً جہدِ مسلسل ہی کامیابی کا زینہ ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ علم و ہنر اور کردار کا بہترین نمونہ ہونا بھی ضروری ہے جو کہ دوسروں کے لئے باعث تقلید ہو، ایک رہبر اور لیڈر کے لئے نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پر سوز رکھنا ضروری ہے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی طلباء سے مخاطب ہو کر انہی اوصاف کو اپنانے کا درس دیتے ہیں:

''اس وقت آپ کو اپنی ذہانت کا ثبوت دینا ہے، اور علم کا وہ نمونہ اور معیار سامنے لے کر آنا ہے جو زبان کے اعتبار سے، اسلوب کے اعتبار سے، مواد کے اعتبار سے مطالعۂ مذاہب اور تقابل ادیان کے اعتبار سے متوجہ کرنے والا ہو جس کو دیکھ کر زمانہ خود اس کا اعتراف کرے کہ آپ نے ایسی چیز سامنے رکھی ہے جو واجب الاعتراف ہے۔

میں اس بات کو پھر دہراؤں گا کہ زمانہ آپ سے ایسی بہت سی نئی چیزوں کا طالب ہے، ان چیزوں سے بہت زیادہ نازک اور اہم چیزوں کا طالب ہے جن کا وہ ہمارے اسلاف سے طالب تھا۔ اقبال کا شعر ہے

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے'' (۲۱)

انسان قسمت اور مقدر کی خود فریبی بلکہ اقبال کے بقول خدا فریبی میں مبتلا ہے۔ اور محنت و جدوجہد کی بجائے حالات کی رو میں بہہ جانے کو پسند کرتا ہے۔ اور اپنا مقدر سمجھ کر قناعت پسندی کا شکار ہو جاتا ہے۔ عالمی تناظر میں مولانا اس تساہل پسندی اور مقدر پر شاکر

ہونے کی بجائے جہدِ مسلسل کا درس اقبال کے پیغام کی صورت میں دیتے ہیں:

''موجودہ عالم اسلام کی بیماری، پریشانی اور بے اطمینانی نہیں ہے بلکہ حد سے بڑھا ہوا اطمینان اور سکون ، دنیا کی زندگی پر قناعت اور حالات سے مصالحت ہے، آج دنیا کا عالمگیر فساد اور انسانیت کا زوال اور ماحول کی خرابی اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں پیدا کرتی، اس کو زندگی کے اس نقشہ میں کوئی چیز غلط اور بے محل نظر آتی نہیں ہے۔ اس کی نظر ذاتی مسائل اور مادی فوائد سے آگے نہیں بڑھتی، اس کی موجودہ افسردگی اور مردہ دلی کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کا پہلو خلش سے اور اس کا دل تپش سے خالی ہے۔

طبیب عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے تابی

اس لئے ضرورت ہے کہ یہ مبارک کش مکش پھر پیدا کی جائے اور اس امت کا سکون برہم کیا جائے اس کو اپنی ذات اور اپنے مسائل کے فکر کی بجائے (جو جاہلی قوموں کا شعار ہے) انسانیت کا درد و غم، ہدایت ورحمت کی فکر اور آخرت اور محاسبہ الٰہی کا خطرہ پیدا ہو، اس امت کی خیر خواہی اس میں نہیں ہے کہ اس کے لئے سکون و اطمینان کی دعا کی جائے بلکہ اس میں ہے کہ اس کے لئے درد و اضطراب کی دعا کی جائے اور برملا کہا جائے۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں'' (۲۲)

کسی فتح یا کامیابی کے حاصل ہونے پر یا کسی اطمینان و غلبہ کے بعد سستی اور کاہلی

کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہر طرف پھیلے ہوئے، ظاہر یا چھپے ہوئے دشمنوں سے محتاط رہنا ضروری ہے۔ فتح کا نشہ بعض اوقات فتح کو شکست میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مولانا سید ابو الحسن ندوی نے اس موضوع پر ایک فصیح و بلیغ خطاب فرمایا، اپنے خطاب کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی تقریر کا موضوع اور اس کا مرکزی نقطہ فاتح مصر سیدنا عمرو بن العاصؓ کے اس تاریخی جملہ کو بنایا جس میں انہوں نے عرب فاتح فوج اور مسلمانوں کو مخاطب کیا تھا، انہوں نے فرمایا تھا ''**انکم فی رباط دائم، لکثرۃ الاعداء حولکم و تشوُّف قلوبھم الیکم**'' (تم اپنے کو مستقل محاذ جنگ پر سمجھو، اس لئے کہ تمہارے چاروں طرف کثرت سے دشمن پھیلے ہوئے ہیں ، اور ان کی نیتیں اور نگاہیں ہر وقت تمہارے اوپر ہیں۔) میں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے دائمی طور پر بیدار اور تیار اور خطرات و امکانات سے خبردار رہنے کی ضرورت بیان کی۔ اسی کے ساتھ تن آسانی اور سہولت پسندی کی زندگی اور اخلاقی گراوٹ اور اجتماعی امراض سے بھی آگاہی دی اور علامہ اقبالؒ کے ایک شعر کی عربی میں تشریح کی

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر'' (۲۳)

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کی سر بلندی کے لئے کام کرنے والے افراد اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داروں سے آگاہ ہوں نیز کھلی آنکھوں سے گردوپیش پر نظر رکھیں۔ انہیں زمانہ کی موجود تحریکات اور ضروریات سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے۔

''داعیان دین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ماحول اور اپنے زمانہ

سے واقف ہوں، زمانہ کی ضروریات ،مقتضیات اور خطرات پر نگاہ ہونی چاہئے۔ ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ زمانہ کے فکری و سماجی رجحانات کیا ہیں؟ کس طرح کی تحریکیں چل رہی ہیں؟ اور اسلام اور مسلمانوں کو کس کس طرف سے خطرات کا سامنا ہے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ زندگی اور معاشرہ میں موثر ہو سکتے ہیں، نہ دین کی موثر خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ بقول اقبال

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ'' (۲۴)

یورپ سے بیزاری

علامہ اقبال کے افکار و نظریات کی چوتھی صفت یورپ کی تہذیب و تمدن اور یورپ کی تعلیم و سیاست پر بھرپور انداز میں تنقید ہے۔ آپ نے یورپ میں زندگی کے کئی سال گزارے اور اس کا قریب سے مشاہدہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تہذیب اندر سے بھیانک صورت رکھتی ہے۔

''آپ اس تہذیب سے مرعوب نہ ہوں، آپ جس درخت کے پھل ہیں وہ نبوت کا درخت ہے ۔ آپ یہاں رہیں لیکن آپ تہذیب کے غلام نہ بنیں۔ آپ شوق سے یہاں فائدہ اٹھائیں لیکن آپ اس مادیت سے مرعوب نہ ہوں۔ آپ اپنا پیغام یاد رکھیں ، آپ اپنی شخصیت کو تحلیل نہ ہونے دیں۔ آپ اس تہذیب کا کلمہ نہ پڑھنے لگیں۔ آپ اپنے کو، اپنے دین کو ، اپنے نظام زندگی کو، اپنی معاشرت کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم حیوان ہیں، اور یہ انسان ہیں،نہیں آپ

انسان ہیں اور یہ حیوان ۔ یہ خطہ بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا ہے، یہاں رات بھی دن ہے لیکن حقیقی روشنی اور رحمت و برکت اور ہدایت کی تجلی سے یکسر محروم ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھویں سے
یہ وادیٔ ایمن نہیں شایان تجلی'' (۲۵)

''محمد اقبال نے اس تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کے کمزور پہلوں کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور اس فساد کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جو اس کے مادی رجحانات مذاہب اور اخلاقی و روحانی اقدار سے اہل مغرب کی بغاوت کی وجہ سے اس کے خمیر میں شامل ہو گیا ہے۔ انہوں نے قلب و نظر کے اس فساد کو جو اس تہذیب کی خصوصیت ہے ،روحِ تہذیب کی آلودگی و ناپاکی پر محمول کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

فساد قلب و نظر ہے افرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق و لطیف (۲۶)

آج کل ہر کسی کے ذہن میں یہ خبط سمایا ہوا ہے کہ یورپ مہذب اور ترقی یافتہ ہے۔ وہاں سکون اور آسائش سے زندگی بسر کی جائے وہاں ہر طرح کے بہترین وسائل حاصل ہیں اور قانون کی بالادستی قائم ہے ،مگر یہ سب تصورات حقیقت سے لاعلمی کی وجہ سے ہیں ورنہ یورپ میں بھی ویسے ہی حالات ہیں جیسے ہمارے ملک میں بلکہ بعض اوقات اس سے بھی بدتر۔ مولانا اکثر یورپ کے دورے پر گئے اور وہاں کے حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع

میسر آیا لہٰذا وہ اس کے چہرے سے نقاب یوں اٹھاتے ہیں:

''کیا ان کو حقیقی امن و اطمینان حاصل ہے؟ کیا وہاں جرائم نہیں ہوتے؟ جرائم میں وہ ممالک ہمارے ملک سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں، دن دیہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں، بڑے بڑے دولت مند اور کارخانہ داروں کو راستہ چلتے اڑا لیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کے عزیزوں کو ڈرا دھمکا کر بڑی بڑی رقمیں وصول کی جاتی ہیں۔ آج ان ملکوں کا اخلاقی زوال اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ان کو اپنی ہستی قائم رکھنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ ایک قوم پرستی اور وطنیت کا شور ہے جو ان کو تھامے ہوئے ہے۔ پھر بھی ان کا زوال کچھ دور نہیں۔ اور اقبالؔ کا یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ (۲۷)

علامہ اقبال نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کافی عرصہ یورپ میں قیام کے باوجود اس نظام سے متاثر ہوئے نہ اس میں جذب ہونے کی سعی کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری آنکھ میں خاک مدینہ و نجف کا سرمہ ہے جس کی وجہ سے میری آنکھیں خیرہ نہ ہوسکیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی مغربی نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ کی اس عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں جو مغربی نظام تعلیم کے سمندر میں غوطہ لگا کر نہ صرف یہ کہ صحیح و سلامت ساحل پر پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہہ سے نکال کر لائے، ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور مستحکم ہو گیا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم اور مغربی

فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا..... لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس آتش نمرود نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔

طلسم علم حاضر را شکستم
زبودم دانه دامش گستم
خداوند که مانند ابراهیم
بنار او چه بے پروا نشستم" (۲۸)

اتحاد امت

افکار اقبال میں پانچواں اہم پیغام اتحاد امت ہے جسے نبی مکرم ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع کے موقع پر پیش کیا کہ رنگ و نسل کی تفریق کو ختم کر کے تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی بن جائیں۔ بلکہ ایک جسم کی مانند کہ اگر کسی ایک حصہ میں کوئی تکلیف ہو تو پورا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ تمام مسلمان خواہ کسی ملک یا علاقہ سے تعلق رکھتے ہوں ایک دوسرے کی تکلیف اور دکھ درد کو محسوس کریں اور اس کے ازالہ کے لئے سرگرم عمل ہوں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اتحاد امت کے اس پیغام کو اقبال کے اشعار سے مزین کر کے پیش کیا ہے:

"آپ معمارِ حرم ہیں آپ کو نئی دنیا کی تعمیر کرنی چاہئے اور صرف معمار حرم کو یہ حق حاصل ہے کہ نئی دنیا کی تعمیر کرے۔ آج دنیا میں تخریب کارگر ہے، آپ جس نبی ﷺ کے امتی ہیں اس نبی کا ہی یہ منصب تھا کہ دنیا کو تمام غلامیوں سے نجات دلا کر خدائے واحد کی غلامی میں داخل کرے اس لئے آپ امریکہ میں ایک کھانے پینے والے ہندوستانی، پاکستانی، مصری اور شامی کی حیثیت سے نہیں ہیں

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی'' (۲۹)

اتحاد و یگانگت ہی کسی قوم کو قوت اور طاقت کو ظاہر کرتی ہے۔ جسے علامہ اقبال نے مختلف تمثیلات میں واضح کیا ہے ۔کبھی فرد کو ربط ملت کا درس دیتے ہیں، اور کبھی نیل کے ساحل سے کاشغر کی سرزمین تک کے مسلمانوں کو اتحاد و بھائی چارے کا حکم دیتے ہیں، مگر تاریخ کا ایک بھیانک المیہ یہ ہے مسلمانوں کی صفوں کو منتشر کرنے اور انہیں شکست سے ہمکنار کرنے میں غیر مسلموں کی بجائے مسلمانوں میں ہی میر جعفر اور میر صادق جیسی شخصیات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''تاریخ اسلام کا سب سے بڑا المیہ نفسانیت کا وہ کھیل ہے جو ہمیشہ اپنا تماشا دکھاتا رہا۔ ہم نے کبھی اپنے دشمنوں سے شکست نہیں کھائی تاریخ عالم اور تاریخ اسلام پر نظر رکھنے والے ایک طالب علم کی یہ بات سن لیجئے اور اس کو اپنے دلوں اور دماغوں میں امانت رکھ لیجئے کہ ہم نے کبھی اپنے دشمنوں سے شکست نہیں کھائی، ہم نے اندرونی اختلافات سے شکست کھائی ہے۔ اسی نفسانیت کی بدولت ہم نے سلطنتیں کھوئی ہیں۔ ہمارے ملکوں کے چراغ گل ہو گئے ہیں۔ اور بعض اوقات اسلام پورے پورے ملکوں سے خارج کر دیا۔

اس کی میں صرف ایک مثال دوں گا، وہ مثال اسپین کی ہے۔ اسپین سے اسلام کو نکالنے والی سب سے بڑی طاقت نفسانیت اور باہمی خانہ جنگی تھی۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا کہ تنہا عیسائی طاقت نے اندلس سے اسلام اور مسلمانوں کو نکالا اور ان کا چراغ گل کر دیا۔ اس میں بہت کچھ دخل تھا شمالی عربوں، حجازیوں اور یمنی عربوں کی باہمی آویزش اور داخلی نزاعات کا جو عرصہ سے چل رہے تھے۔ یمنی اور حجازی، ربیعہ اور مضر کی باہمی

جنگ سے یہ نوبت آئی کہ اسلام اسپین سے آخری طور پر نکال دیا گیا اور ملک، اقبال کے الفاظ میں آذانوں سے محروم ہو گیا

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے آذاں

یہی داستان اکثر اسلامی ملکوں کی ہے، برصغیر ہند میں مغلوں کا شیرازہ بکھیرنے والی، مسلمانوں کو اقتدار سے محروم کر دینے والی اور ان کی طاقت کا چراغ گل کر دینے والی چیز یہی نفسانیت ہے۔'' (۳۰)

موجودہ زمانہ میں بھی حالات انتہائی دگرگوں ہیں، مغرب اور لادینی عناصر مسلمانوں کو بدنام اور کمزور کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں جس کی وجہ سے عالم اسلام اضطراب میں مبتلا ہے۔ وہ اسلام اور مغربیت کی کشمکش کی وجہ سے خود کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اصلاح احوال کے لئے بھرپور جدوجہد کی ضرورت ہے۔

''عالمگیر صورت حال کی تبدیلی کے لئے اور عالم اسلام کے حالات میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کے لئے دین کے داعیوں کو اس طبقہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کہ اسی طبقہ کی غلط اندیشی اور بے راہ روی نے عالم اسلام کو ذہنی ارتداد کے خطرہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسلامی ممالک کا رخ اسلامیت کی بجائے خالص مغربیت کی طرف موڑ دیا ہے۔ اور عوام کو بے زبان گلہ اور جانوروں کے ریوڑ کی طرح غیر اسلامی قیادت کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ اور اسی طبقہ کی اصلاح سے دوبارہ ان ممالک کا رخ مغربیت سے اسلامیت کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی'' (۳۱)

حوالہ جات

۱۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، نقوش اقبال ، طبع چہارم،مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ص ۳۲

۲۔ ایضاً ص ۴۰ ۳۔ ایضاً ص ۱۴

۴۔ ایضاً ص ۳۳۔۳۴ ۵۔ ایضاً ص ۳۸۔۳۹

۶۔ ایضاً ص ۶ ۷۔ ماہنامہ، فاران ، کراچی ، مئی ۱۹۷۱ء

۸۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، نقوش اقبال ،طبع چہارم ص ۹

۹۔ ایضاً ص ۵

۱۰۔ محمد منور، پروفیسر ،کلیات اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔ص ۲۳۶

۱۱۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، حصہ ہفتم ،مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ص ۲۲۲

۱۲۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، پاجا سراغِ زندگی ،مجلس نشریات اسلام، کراچی ص ۱۱۰

۱۳۔ ایضاً ص ۱۰۸۔۱۰۹

۱۴۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، کاروان زندگی، حصہ سوم ،مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ص ۳۰۴

۱۵۔ ایضاً ص ۹۷

۱۶۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، پاجا سراغ زندگی ،مجلس نشریات اسلام،کراچی۔ص ۱۰۳

۱۷۔ ایضاً ص ۱۰۳۔۱۰۴

۱۸۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر،مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ص ۱۵

۱۹۔ ایضاً ص ۳۷۳

۲۰۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، حصہ سوم مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ص ۱۸

۲۱۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، پاجا سراغ زندگی، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۸۹۔۹۰

۲۲۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۳۳۵

۲۳۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، حصہ سوم، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۴۹۔۵۰

۲۴۔ ایضاً ص ۲۴

۲۵۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، صاف صاف باتیں، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۴۹۔۵۰

۲۶۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۱۱۔۱۱۲

۲۷۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، تعمیر انسانیت، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۱۳۵۔ ۱۳۶

۲۸۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۲۴۸

۲۹۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، صاف صاف باتیں، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۲۸

۳۰۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، صاف صاف باتیں، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۱۱۲۔۱۱۳

۳۱۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، اسلام اور مغربیت کی کشمکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔ ص ۲۷۶